ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم السیّد
صدر شعبۂ اردو
الازہر یونی ورسٹی، قاہرہ، مصر

سر سیّد احمد خان مصری جامعات میں: ایک تجزیہ

ABSTRACT

Sir Syed Studies in Egyptian universities.
By Dr. Ibrahim Muhammad Imbrahim Al-Sayed, Head of the Department of Urdu, Al-Azhar University, Cairo, Egypt.

Sir Syed Ahmed Khan, with his imposing personality and extraordinary work, has become a subject of research and study all over the world. At Egyptian universities too, Sir Syed has been a subject of research and critical evaluations. This article first briefly introduces Sir Syed's life and his works and the role he played in the cultural, educational and political life of the subcontinent and its citizens. Then the author surveys and analyses the studies and research and critical works taken up at various Egyptian institutes of higher learning and universities. The author has presented a comprehensive picture of whatever and wherever is written on Sir Syed in Egypt.

سر سید احمد خان انیسویں صدی میں برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں میں ایک ممتاز شخصیت کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آج بھی انھیں پاکستان اور ہندوستان میں ایک عظیم شخصیت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں بیداریِ علم کی تحریک پیدا کرنے میں انھوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستان کے طول وعرض میں جس جذبہ سے انھوں نے مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیا، اس کو عام طور پر سراہا گیا۔ گو ان شعبوں میں بھی ہر ایک کو ان کے نظریات سے، خصوصاً مذہبی امور میں، کلی اتفاق نہ تھا۔ اس کے باوجود کوئی یہ انکار نہیں کرسکتا کہ سر سید احمد خان برِصغیر پاک وہند میں مسلم نشاۃِ ثانیہ کے بڑے علمبردار رہے۔ جب سر سید نے اپنی قومی زندگی کا آغاز کیا، اس وقت مسلمان انتشار کا شکار تھے۔ کوئی لائحۂ عمل نہ تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ جس طرح تالاب میں ٹھہرا پانی آئے دن زیادہ بدبودار ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمان بھی بگڑتے جا رہے تھے۔ سر سید کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔[1]

سرسید احمد خان:

سرسید احمد خان ۵/ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ، مطابق ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۷ یا ۱۸ برس کی عمر میں سرسید کی شادی ہوئی۔ ان کا پہلے بیٹے سید حامد ۱۸۴۹ء میں اور دوسرے بیٹے سید محمود ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۲ برس کی عمر میں والد فوت ہوئے۔ لہٰذا انھیں ملازمت کرنا پڑی۔ ملازمت میں دور دراز کے اضلاع میں تبادلے ہوتے رہے۔ ان کی والدہ عزیز النسا بیگم ۱۸۵۷ء میں فوت ہوئیں۔ اور ان کی اہلیہ کا انتقال ۱۸۶۱ء میں ہوا۔

سرسید کی تعلیم پرانے اسلامی اصولوں پر ہوئی تھی۔ قرآن مجید پڑھنے کے بعد فارسی کی ابتدائی کتابیں، خالق باری اور گلستان، بوستان وغیرہ پڑھیں۔ اس کے بعد عربی کی شرح ملا اور شرح تہذین جیسی کتابیں پڑھیں۔(۲)

سرسید ایک ذہین، نہایت ذکی الحس، سریع الانفعال اور دردمند قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے متوسط درجے کی دینی تعلیم پائی تھی۔ اور دینی علوم اور کتاب وسنت پر ان کی نظر گہری اور وسیع نہ تھی۔ جلد رائے قائم کر لینے اور جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کرنے کے عادی تھے۔(۳)

سرسید کی ملازمت کا آغاز ۱۸۳۸ء سے ہوا جب وہ دہلی میں سرشتہ دار مقرر ہوئے۔ ۱۸۳۹ء میں نائب منشی اور ۱۸۴۱ء میں امتحان منصفی پاس کر کے منصف ہوئے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دلی کے صدر امین رہے۔ ۱۸۵۵ء میں سرسید بجنور منتقل ہوگئے۔ بجنور ہی میں تھے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی۔ انگریزوں کی ملازمتوں کے سلسلے میں سرسید کا تبادلہ ۱۸۵۸ء میں صدر الصدور کی حیثیت سے مراد آباد، ۱۸۶۲ء میں غازی پور، ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ اور ۱۸۶۷ء میں بنارس میں ہوا۔ ۱۸۷۶ء میں ۳۷ سال کی ملازمت کے بعد سرسید احمد خان چھ سو روپے ماہانہ وظیفہ پر ریٹائر ہوگئے۔ اور ۱۸۹۸ء میں ۸۱ سال کی عمر میں انھوں نے وفات پائی۔

تصانیف:

تصنیف وتالیف کے میدان میں سرسید احمد خان نے پچاس کتابوں کے قریب لکھیں۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ جامِ جم: فارسی زبان میں تیموری سلاطین (امیر تیمور صاحبقران سے لے کر ابوظفر بہادر شاہ ظفر تک) سے متعلق: ۱۸۳۹ء۔

۲۔ انتخاب الاخوین: اس میں سرسید نے قواعد منصفی بیان کیے۔

۳۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب: ایک میلاد شریف، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر مختصر رسالہ: ۱۸۴۳ء۔

۴۔ تحفۂ حسن: شاہ عبد العزیز دہلوی کے ''تحفۂ اثنا عشریہ'' کے باب دہم ودوازدہم کا اردو ترجمہ: ۱۸۴۴ء۔
۵۔ التسہیل فی جر الثقیل: عربی کے ایک رسالہ کا فارسی ترجمہ (معیار العقول) کا اردو ترجمہ: ۱۸۴۴ء۔
۶۔ آثار الصنادید: دہلی کی تقریباً دوسو عمارات اور ایک سو بیس مشاہیر کے احوال پر مشتمل: ۱۸۴۷ء
۷۔ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار: سرسید کے نانا کی بعض فارسی تحریرات کا ترجمہ
۸۔ قول متین در ابطال حرکت زمین: زمین کی گردش کی تردید اور آسماں کی گردش کی حمایت پر ایک رسالہ۔
۹۔ کلمۃ الحق: پیری مریدی کے مروجہ طریقے پر تنقید: ۱۸۴۹ء
۱۰۔ راہِ سنت وردِ بدعت: اہلِ تقلید کے مروجہ عقائد ورسوم پر تنقید: ۱۸۵۰ء
۱۱۔ نمیقہ: در بیان مسئلۂ تصور شیخ: ۱۸۵۲ء
۱۲۔ سلسلۃ الملوک: آثار الصنادید کا ایک حصہ جو بعد میں الگ شائع کیا گیا: ۱۸۵۲ء
۱۳۔ کیمیائے سعادت: امام غزالی کے چند اوراق کا اردو ترجمہ: ۱۸۵۳
۱۴۔ تاریخ ضلع بجنور: ضلع بجنور کی تاریخ، جنگ آزادی میں ضائع ہوگئی: ۱۸۵۵ء
۱۵۔ آئین اکبری کی تصحیح اور حواشی: تین جلدوں پر مشتمل کتاب، جنگ آزادی میں دوسری جلد ضائع ہوگئی، اب اس کی پہلی اور تیسری جلد موجود ہے
۱۶۔ تاریخ سرکشیٔ بجنور: ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۸ء تک کے جنگ آزادی کے واقعات۔
۱۷۔ اسباب بغاوت ہند: ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش: ۱۸۵۸ء
۱۸۔ تحقیق لفظ نصاریٰ: قرآن وحدیث اور لغت کی روشنی میں لفظ نصاریٰ کی تشریح
۱۹۔ تاریخ فیروز شاہی کی تحقیق: ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فرمائش پر ضیا برنی کی کتاب تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح اور حواشی: ۱۸۶۲ء
۲۰۔ تبیین الکلام: انجیل اور قرآن مجید کی اصولی وحدت ثابت کرنے کی کوشش
۲۱۔ رسالہ احکام طعام اہل کتاب: اسلامی شعائر کا عملی نقطہ نظر سے جائزہ، اور ان پر عقلی استدلال۔ ۱۸۶۸ء
۲۲۔ مسافرانِ لندن: یہ کتاب سرسید کے سفر انگلستان (اپریل ۱۸۶۹ء سے اکتوبر ۱۸۷۰ء تک) کے مشاہدات وتاثرات پر مشتمل ہے۔
۲۳۔ خطباتِ احمدیہ سر ولیم مور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کے اعتراضات کا تیرہ خطبات پر مشتمل جواب۔
۲۴۔ تفسیر القرآن (غیر مکمل): سرسید کی آخری تصنیف، اس کا محور دین میں صرف قرآن مجید یقینی ہے باقی سب کچھ (حدیث، اجماع اور قیاس) اصولِ دین میں شامل نہیں۔

اخبار اور رسائل:

۱۔ رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا: ۱۸۶۰ء میں جاری ہوکر ۱۸۶۱ء میں بند ہوگیا

۲۔ سائنٹفک سوسائٹی اخبار: ۱۸۶۶ء میں سرسید نے یہ اخبار علی گڑھ سے نکالا بعد میں اس کا نام ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' رکھا۔

۳۔ تہذیب الاخلاق: ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہونا شروع ہوا اور تین دفعہ نئی زندگی پائی۔[۴]

سرسید کی تعلیمی وادبی تحریک:

سرسید احمد خان کے کاموں کو مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ کام جو بحیثیت مصنف انھوں نے تاریخ، مذہب، معاشرت اور ادب کے موضوعات پر تصنیف وتالیف کے ذریعے انجام دیے۔ دوسرے وہ کام جو بحیثیت مصلح انھوں نے مذہبی اور معاشرتی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے لیے کیے۔ اور تیسرے وہ کام جو انھوں نے سیاسی اور قومی سطح پر مسلمانوں کے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لیے انجام دیے۔

سرسید احمد خان نے تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کو ہندوستان کی دوسری قوموں کی سطح پر پہنچادیں۔ لہٰذا انھوں نے مسلمانوں میں جدید تعلیم رائج کر کے انھیں ایک نیا حوصلہ دیا۔ اسی کے طفیل مسلمانوں نے سیاست میں جدید رجحانات کو قبول کیا اور ہندوستان کی سیاسی زندگی میں اپنی حیثیت اور قومیت کے اظہار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

سرسید نے زیادہ زور جدید تعلیم پر دیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جدید تعلیم کے بغیر مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں کی موجودہ بدحالی کا بڑا سبب مسلمانوں کا انگریزی علوم سے بے بہرہ ہونا ہے۔ ان کی رائے میں مسلمانوں کو انگریزی زبان اور تہذیب سے نفرت کا رویہ ترک کر کے مفاہمت کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ جدید اور اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کے حوالے سے کہتے ہیں:

> بس ہم کو جو طریقہ اختیار کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم اس پولیٹیکل شور وغوغا سے اپنے تئیں علیحدہ رہیں۔ اور ہم اپنے حال پر غور کریں۔ اور دیکھیں کہ ہم علم میں کم ہیں، اعلیٰ درجے کی تعلیم میں کم ہیں، دولت میں کم ہیں۔ بس ہم کو اپنی قوم کی تعلیم پر کوشش کرنی چاہیے... سب باتوں کا حاصل ہونا تعلیم پر موقوف ہے۔ جب تم پوری تعلیم پاؤ گے، اور سچی تعلیم تمھارے دلوں میں بیٹھے گی تو خود تمھارے دل میں ان

حقوق کا خیال پیدا ہوگا جو تم واجبی طور پر برٹش گورنمنٹ سے پا سکتے ہو۔(۵)

چناں چہ ۱۸۶۱ء میں جب سر سید مراد آباد میں تھے تو انھوں نے ایک انگریزی سکول قائم کیا ۱۸۶۴ء میں غازی پور کے قیام کے دوران وہاں بھی جدید طرز کا ایک سکول کھولا۔ ۱۸۶۲ء میں انھوں نے ''سائنٹفک سوسائٹی'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ نئے علوم کی کتابیں اردو زبان میں شائع کی جائیں۔ اور اس طرح مسلمان مغرب کی ترقی اور خیالات سے آگاہ ہوں۔

۱۸۶۴ء میں سر سید کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا۔ اور سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ آ گیا۔ یہیں سے ۱۸۶۶ء میں سوسائٹی کا ایک اخبار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے نام سے نکالا جس میں سر سید خود بھی مختلف مضامین لکھتے تھے۔ اور انگریزی اخباروں سے بھی اچھے اچھے مضامین کے ترجمے شائع کراتے تھے اسی سال سرسید نے ''برٹش انڈین ایسوسی ایشن'' قائم کی۔

۱۸۷۰ء میں لندن سے واپسی کے بعد سر سید نے اپنا مشہور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ ''تہذیب الاخلاق'' نے اردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ تہذیبی، سماجی، مذہبی اور تعلیمی موضوعات پر ان کے مضامین جو نئی فکر اور بالکل نئے اسلوبِ بیان سے بہرہ ور تھے، جدید اردو ادب کا سنگِ بنیاد بن گئے۔(۶) ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے اور ''سائنٹفک سوسائٹی'' کے حوالے سے سر سید احمد خان نے اپنے رفقا کی ایک پوری جماعت تیار کر لی تھی۔ اس جماعت میں نواب محسن الملک، مولانا الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد دہلوی اور دیگر کئی اکابرین شامل تھے ''تہذیب الاخلاق'' کی اہمیت کا اندازہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرسید نے جس سماجی، مذہبی اور تعلیمی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا ''تہذیب الاخلاق'' اسی کا داعی تھا سرسید کی تمام نزاعی تحریریں اس میں شائع ہوتی تھیں۔

سر سید کا مقصد تھا کہ نوعمر مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف راغب کیا جائے تا کہ یہ نوجوان سرکاری نوکریوں اور قوم کی خدمت میں اپنے جائے مقصود حاصل کر سکیں۔ اس منصوبے اور ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے انھوں نے سن ۱۸۷۵ء میں ''علی گڑھ کالج'' کی بنیاد ڈالی۔ یہ دانشگاہ اپنے وقت میں اسلامی جدیدیت کا واحد مرکز بنی۔ اور اس منبع سے نوجوان تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد سرکاری ملازموں اور اہلِ فکر کی نکلی جنھوں نے اسلام پر مغربی ممالک کے اعتراضات کی عذر خواہی کی۔ یہ کالج بظاہر ایک تعلیمی ادارہ تھا مگر اسے برعظیم پاک وہند کے مسلمانوں کے ایک اہم سیاسی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ سر سید کی وفات کے بعد نواب محسن الملک نے ''علی گڑھ کالج'' کو یونی ورسٹی کے درجے تک پہنچانے کے لیے کوشش شروع کی۔ لیکن حکومت نے چند ایسی شرطیں عائد کیں کہ نواب وقار الملک، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا شبلی نے ان کی مخالفت کی۔ جس کی وجہ سے یونی ورسٹی کا معاملہ عرصے تک کھٹائی میں پڑا رہا.... اور بالآخر کارکنان علی گڑھ کالج نے انھی شرائط پر یونی ورسٹی بنانی قبول کر لی۔ اور جنوری ۱۹۲۱ء بمطابق ۱۳۴۰ھ سے پرانا علی گڑھ کالج مسلم یونی ورسٹی میں منتقل ہوگیا۔ (۳۵)

سر سید احمد خان اور مصر:

سر سید احمد خان نے ۱۸۶۹ء میں لندن جاتے ہوئے مصر کا سفر کیا۔ تھوڑے عرصے کے لیے مصر میں رہے۔ پھر لندن چلے گئے۔ سر سید انگلینڈ میں تقریباً ڈیڑھ سال کے لگ بھگ رہے۔ پھر جب انڈیا واپس چلے گئے تو انھوں نے ایک مجلہ ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے نکالا۔ اسی مجلّے میں مصر کے بارے میں چار مقالے لکھے۔ تین مقالے مصری معاشرے اور مصریوں کی ثقافت اور تعلیم کے حوالے سے تھے۔ جب کہ چوتھا مقالہ اس زمانے میں شاہِ مصر کے بارے میں تھا۔ کہتے ہیں: ''مشہور ہے کہ مسلم ریاستوں میں سے مصر نے تہذیب وشائستگی میں بہت ترقی کی ہے، اس لیے ہم اُس کا کچھ حال جو ہماری آنکھ کا دیکھا ہے لکھتے ہیں۔''(۷)

سر سید نے اپنے مقالات میں مصر میں رہنے والے لوگوں کو چار طبقوں میں تقسیم کیا۔ پھر انھوں نے ان چار طبقوں کے طرز زندگی کے بارے میں تفصیلاً گفتگو کی۔ پہلے طبقے، یعنی مصر میں رہنے والے ''یورپین'' کے متعلق کہتے ہیں: ''یورپ کی قومیں جو مصر میں ہیں اگرچہ وہ بہ نسبت اُن یورپین قوموں کے جو خاص یورپ میں رہتی ہیں، تہذیب وشائستگی میں کم ہیں، لیکن پھر بھی نہایت مہذب اور شائستہ اور تربیت یافتہ ہیں۔''(۸)

دوسرے طبقے، یعنی مسلم مصری امیروں اور اونچے عہدے والے ملازموں کے بارے میں کہتے ہیں: ''مسلمان امرا وروٴسا وعہدہ داران نے بالکل اپنا قدیم طریقہ اور قدیم لباس اور پرانا طرز زندگی چھوڑ دیا ہے۔ سب کے سب کوٹ پتلون پہنتے ہیں، اور لال پھندنے دار ترکی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ مثل یورپین کے اپنے مکانات کو صاف پھولوں اور پھولدار درختوں سے آراستہ رکھتے ہیں میز وکرسی پر بیٹھتے ہیں چھری کانٹے سے کھانا کھاتے ہیں۔ اکثر فرنچ، عربی اور ترکی تینوں زبانیں جانتے ہیں اُن کی نسبت مجھ کو کہنا چاہیے کہ اگر بالکل یورپین کی مانند مہذب نہیں ہوگئے ہیں تو اُن کی پوری پوری نقل تو ضرور کی ہے۔''(۹)

تیسرے طبقے، مصری عیسائیوں کے بارے میں کہتے ہیں: ''مصری عیسائی بھی تہذیب وشائستگی میں کم نہیں۔ انھوں نے اپنے ہم مذہب یورپین بھائیوں کا سا برتاؤ اور طریقہ اختیار کیا ہے۔ میں دو ایک مصری عیسائیوں سے ملا، اور اُن کو تہذیب وشائستگی میں آراستہ پایا۔ وہ سب قبطی نسل کے تھے اور اُن میں سے ایک شخص باوجود کہ بجز عربی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتا تھا، مگر ہر بات اور عادات اور بات چیت میں مثل یورپین جنٹلمین کے مہذب تھا۔''(۱۰)

چوتھے طبقے، یعنی متوسط اور ادنیٰ طبقے کے بارے میں کہتے ہیں: ''متوسط درجے اور ادنی درجے کے مسلمان مصری جو بہت کثرت سے ہیں، نہایت خراب اور ابتر حالت میں ہیں۔ میلے اور نہایت میلے اور لباس نہایت خراب اکثر نیلا کُرتا، جس کا گریباں کھلا ہوا ہے پہنے ہوئے ہیں۔ اور ٹانگوں میں کوئی چیز نہیں۔ بالکل ننگی، اور کپڑا ایسا میلا کہ شاید پہننے کے مابعد کبھی دھونے کی نوبت نہیں آتی ہوگی۔ پاس بٹھانے کو دل نہیں چاہتا۔ بدن وکپڑوں میں سے بُری بُو آتی ہے۔

متوسط درجے کی عورتوں کی حالت بہ نسبت مردوں کے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر ادنی درجے کی عورت ومرد کی نہایت خراب حالت معلوم ہوتی ہے۔ اور جو کہ یہی لوگ سب سے زیادہ کثرت سے ہیں، اس لیے مصر باعتبار خلقت کے آنکھ میں نہایت بُرا اور خراب معلوم ہوتا ہے۔ مصر میں جاؤ اور عام طور پر وہاں کی خلقت پر نظر ڈالو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ ہندوستان میں قحط کے دنوں میں بھٹیر کی طرف کے لوگ عورت ومرد نیلے کرتے پہنے ہوئے، اور تباہ حالت میں چلے آتے ہیں۔ تمام یورپین؛ کیا مرد اور کیا عورت، اُن لوگوں میں ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے اندھیری رات میں تارے یا کوڑے میں موتی۔''(۱۱)

عام مصری لوگوں کے گفتگو کرنے کے طریقے کے بارے میں کہتے ہیں: ''اس درجہ کے لوگوں کا لہجہ گفتگو ایسا ناشائستہ اور خراب ہے کہ ان کی نا مہذب آواز کی دل پر چوٹ لگتی ہے۔ بہت بلند اور حلق میں نکلنے والی اور نہایت درشت آواز سے جس میں گردن کی رگیں تن جاتی ہیں باتیں کرتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو جانور آپس میں لڑ رہے ہیں۔ پہلے پہل جب میں نے مصریوں کو آپس میں بات چیت کرتے دیکھا، تو میں نے خیال کیا کہ بہ سبب عربی زبان ہونے کے، جس میں حروف حلقی زیادہ ہیں، ان کا لہجہ ایسا خراب ہے۔ مگر میں نے جب قبطی عیسائیوں کو دیکھا جو تربیت یافتہ تھے۔ ان کا لہجہ نہایت سبک اور آواز نرم اور آہستہ بات کرنا سب کچھ عمدہ تھا۔ ان کے منہ سے لفظ پیارے معلوم ہوتے تھے۔ اور عورتوں کے منہ سے تو عربی لفظ نہیں نکلتے تھے، بلکہ پھول جھڑتے تھے۔''(۱۲)

اس کے باوجود سر سید احمد خان نے کہیں کہیں مصریوں کی تعریف کی۔ کہتے ہیں:

> ہر قسم کا ہنر مصریوں میں ترقی پر ہے۔ تمام کام ریل کے چلانے کا مصری خود آپ کرتے ہیں۔ دھویں کی کل سے کام لیتے ہیں۔ دھویں کا پمپ اور دھویں کا ہل گنوار دہقانوں کو چلاتے میں نے دیکھا۔ کاغذ بنانے کی کل جو دھویں سے چلتی ہے مصری چلاتے ہیں۔ اور کاغذ بناتے ہیں۔ دھویں کی کل سے مصری چھاپے خانے کا کام کرتے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کے سبب مصریوں کو ہندوستان کے مسلمانوں سے، باوجود یہ کہ ہندوستان کے مسلمان ان سے بہت زیادہ خوش حال ہیں، ہم فوقیت دیتے ہیں۔(۱۳)

مصر کے قومی عجائب گھر کے بارے میں کہتے ہیں: ''میوزم مصر کا یعنی عجائب خانہ ایسا عمدہ ہے کہ مصر کی پرانی چیزوں کے لیے اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ پرانی لاشیں جو ممی کہلاتی ہیں، اور پرانی صنائع مصر کی نہایت خوب صورتی اور عمدگی سے آراستہ ہیں۔ اور بہت فائدہ بخش عبرت انگیز اور حیرت خیز ہیں۔''(۱۴)

سرسید مصریوں کی نظر میں:

مصر میں سر سید کا تعارف غالباً سید جمال الدین افغانی کے عربی میں جاری کردہ مجلہ ''العروۃ الوثقیٰ'' کے مقالات سے شروع ہوا یہ مجلہ پیرس میں ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء کو نکلنا شروع ہوا۔ اس کا آخری شمارہ ۱۷/ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو شائع ہوا سید جمال الدین افغانی کو سرسید احمد خان کے مذہبی افکار وخیالات اور سیاسی رجحانات سے اختلاف تھا لہٰذا انھوں نے مجلہ ''العروۃ الوثقیٰ'' میں سرسید پر سخت تنقید کی مصریوں نے سرسید کے بارے میں اس مجلّے کے ذریعے ایک رائے قائم کی، جس کا نچوڑ یہ ہے کہ دینی حوالے سے سرسید کے خیالات گمراہ کن تھے۔

مصر میں سرسید احمد خان سے تعارف کا دوسرا مصدر مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کی عربی تصانیف تھا چوں کہ مولانا سید سلیمان ندوی جیّد عالم تھے عربی زبان پر پورا عبور حاصل تھا، ان کی کئی تصانیف عربی میں تھیں، عالمِ عرب میں بالعموم اور مصر میں بالخصوص ان کو اور ان کی تصانیف کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لہٰذا ان کا عالمِ عرب پر مصریوں سمیت گہرا اثر رہا اور یہاں سے بھی مصریوں کا سرسید سے تعارف شروع ہوا اور چوں کہ سید سلیمان ندوی کو سرسید کے مذہبی نقطہ نظر اور دینی رجحانات سے اختلاف تھا اور انھوں نے اپنی کتابوں میں سرسید کے اس پہلو پر تنقید کی لہٰذا سرسید کے حوالے سے جو تصور مصریوں (اور خاص کر دینی حلقوں) کے ذہن میں اُبھرا، وہ شروع میں یہاں سے آیا یعنی کہ سرسید عقل پسندی سے اتنے متاثر تھے کہ شریعت کے اصول اور احکامات کو منطقی طور پر ثابت کرنا چاہتے تھے۔ تفسیر کے اصولوں کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ قرآن پاک کو نئے معانی پہنانے کی سعی کی۔ احادیث اور معجزوں سے انکار کیا۔ مستند علما اور مفسرین پر تنقید کی۔ قرآن پاک، حدیث شریف، فقہ اور فلسفے کے ہر مسئلے میں نیچر کی تاویل یا تعبیر ضرور کی۔

ایک اور بات تھی جس نے شاید مصریوں کے ذہن میں سرسید احمد خان کے بارے میں قائم شدہ تصور کو بالواسطہ طور پر تقویت دی، وہ سرسید کی مصر پر انگریزوں کے قبضے کی حمایت تھی انگریزوں سے اپنی انتہائی وفاداری والی پالیسی کے تحت سرسید احمد خان اور سید امیر علی نے انگریزوں کے اس موقف کی حمایت کی کہ مصر بحران کی حالت سے دوچار ہے۔ احمد عرابی کو مرعوب کرنے کی خاطر انگریزوں نے اپنی فوج مصر بھیجی۔ اس فیصلے کی بھی انھوں نے تائید کی۔ سید امیر علی نے ہندوستان سے ''لندن ٹائمز'' کو ایک خط لکھا جس میں احمد عرابی کی مذمت کی، اور اعلان کیا کہ ہندوستان کے تمام مسلمان مصر پر انگریزوں کے قبضے کی پوری حمایت کرتے ہیں۔(۱۵)

سرسید سے مصریوں کا مزید تعارف بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ہوا جب مصری دانشور اور ادیب احمد امین نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث: جدید دور میں اصلاح کے سرخیل'' لکھی، جس میں انھوں نے سرسید کے بارے میں ایک مستقل فصل لکھی۔ احمد امین کو سرسید کی شخصیت اور کارنامے پسند تھے۔ وہ ان کی عقلیت پسندی سے کافی متاثر تھے چناں چہ اپنی کتاب میں ان کی تعریف کی ان سے ہمدردی کا اظہار کیا، اور ان علمائے

دین کی مذمت کی جنھوں نے سرسید کی مخالفت کی اور ان پر کفر والحاد اور گمراہی کے فتوے صادر کیے۔ ان علما کے حوالے سے لکھا کہ وہ صرف دین کو سطحی طور پر جانتے ہیں۔ اور دین کی اصل حقیقت نہیں جانتے۔ ایسے علما چاہتے ہیں کہ جدید تہذیب ومدنیت کو اپنی محدود عقل کے تابع بنائیں۔ اور جدید تہذیب ومدنیت کو کافر سمجھتے ہیں، کہتے ہیں:

> سرسید نے دیکھا کہ ہندوستان میں تقریباً سات کروڑ مسلمان ہیں، جن میں غربت، جہالت، مایوسی اور پریشانی پھیلی ہوئی ہے ان میں سے جس کسی نے تعلیم حاصل کی تو بے فائدہ دینی تعلیم حاصل کی، جو لوگوں میں نہ تو وسعتِ نظر، اور نہ ہی زندگی کی حرارت پیدا کرسکتی تھی یہ مسلمان ایسے علمائے دین کی پیروی کرتے ہیں جو خود دین کے بارے میں سطحی علم رکھتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ جدید وسیع مدنیت کو اپنی محدود عقل کے تابع کر لیں وہ نہ زمانے کی تبدیلی کا اعتراف کرتے ہیں، نہ زندگی کی رنگینی کا، اور نہ ہی علمی ترقی کا وہ خود جامد زندگی گزار رہے ہیں جب کہ ان کے ارد گرد باقی دنیا بہت متحرک ہے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ آج کل کی جدید تہذیب، اس کا علم، اس کا نظام اور اس کے وسائل ومقاصد سمیت سب کفر ہے جس سے مسلمان کو مدد نہیں لینا چاہیے، اور نہ ہی اس کے لوگوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے یہ علما سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے جدید مدنیت کے لیے اپنا دل کھول دیا تو ان کے عقیدے برباد ہوجائیں گے، اور وہ خارج از دین ہوجائیں گے۔(۱۶)

احمد امین نے اپنی اس کتاب میں سرسید کو محمد عبدہ سے تشبیہ دی دونوں کو اپنے اپنے ملک میں مصلح قرار دیتے ہیں دونوں کے نزدیک معاشرے کی اصلاح تعلیم سے شروع ہوتی ہے وہ سمجھتے تھے کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے برسرِاقتدار قابض حکومت سے مدد لینے، اس کے ساتھ تعاون کرنے اور اس کے ساتھ ٹکر نہ لینے میں کوئی حرج نہیں کہتے ہیں:

> ہندوستان میں سرسید ایسے ہیں جیسے مصر میں شیخ محمد عبدہٗ دونوں کے نزدیک لوگوں کی اصلاح تعلیم وتہذیب پھیلانے، اور دین کے معاملے میں رواداری اور غیر متعصب رویہ اپنانے میں ہے پھر آزادی خود بخود آتی ہے جاہل اور کم عقل کے لیے کوئی آزادی نہیں ہوتی آزادی کی بنیاد علم ہے؛ دین اور دنیا کا علم جدیدیت کے تمام علوم جیسے فزیکس، کیمسٹری، ریاضی، فلکیات، سائیکلوجی، سوشیالوجی وغیرہ کے ساتھ ساتھ دین کا وہ علم ہونا چاہیے جو دلوں کو زندہ کرتا ہے، عقل کو مقید نہیں کرتا، روح کو غذا مہیا کرتا اور سوچنے پر پابندی نہیں لگاتا اسلام کو اگر صحیح اصولوں کے مطابق سمجھا

جائے تو وہ یہ سب مہیا کرتا ہے محمد عبدہٗ اور سرسید دونوں یہ جانتے ہیں کہ مصر اور ہندوستان دونوں کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور انگریزوں کی مادی طاقت جیسے بری اور بحری جنگی ہتھیار، اور علمی وسیاسی طاقت کے سامنے نہ مصر ٹھہر سکتا ہے نہ ہندوستان۔(۱۷)

احمد امین اپنی کتاب میں سرسید کی بہادری اور حق کہنے میں بیباکی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سرسید اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں بے حد بہادر تھے اپنی رائے کے اظہار میں بے حد واضح اور دوٹوک تھے اپنے اُوپر تنقید کرنے والوں کی تنقید کو اہمیت نہیں دیتے تھے وہ صرف اپنے ہی ضمیر کی آواز سننے پر مُصر ہوتے تھے انگریزوں کے غرور تکبر، اہلِ وطن کی پسماندگی، علمائے دین کے جمود، اور سیاست دانوں کے غیر صحت مندانہ خیالات پر تنقید کرتے تھے۔(۱۸)

چند سال بعد مصر کے معروف دانشور اور عالمِ دین ڈاکٹر محمد الہبی سابق رئیس جامعہ ازہر نے ۱۹۵۷ء میں ''الفکر الاسلامی الحدیث وصلتہ بالاستعمار الغربی: جدید اسلامی فکر اور اس کا مغربی سامراج سے رشتہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں انھوں نے عالمِ اسلام کے مصلحین کے بارے میں تفصیلاً گفتگو کی ڈاکٹر محمد الہبی نے اپنی کتاب میں سرسید کے بارے میں سید جمال الدین افغانی کی رائے کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھا کہ سید احمد خان کی تحریک علوم طبیعہ اور مغرب کی مادی تہذیب کے عشق وشیفتگی پر قائم تھی، اسی طرح جس طرح زمانہ حال کے بعض مفکرین سائنس اور اس کی ایجادات وفتوحات سے ضرورت سے زیادہ مرعوب ہیں، جن پر موجودہ مغربی تہذیب قائم ہے۔ علوم طبیعہ یا طبیعیات سے اس قدر وابستگی اور عشق، روحانی اور مثالی اقدار کی قیمت کم کر دیتا ہے، حالاں کہ یہ قدریں وہ ہیں جن پر آسمانی مذاہب کی بنیاد ہے، اور جس کی نمائندگی سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اسلام نے کی ہے۔ علوم طبیعہ سے یہ غیر معمولی لگاؤ، بعض اوقات ہر اس چیز کے انکار تک پہنچا دیتا ہے جو انسانی حس اور مشاہدہ میں نہ آ سکے۔ یہی چیز تھی جس کا رشتہ سید جمال الدین افغانی نے سرسید احمد خان کے الحاد، اور ان کے مذہب نیچری سے جوڑا ہے۔ اور باوجود ان کے بار بار یہ کہنے کہ وہ اسلام کا دفاع کر رہے ہیں، انھوں نے ان پر الحاد کا الزام لگایا۔(۱۹)

سرسید احمد خان کے حوالے سے ڈاکٹر محمد الہبی نے مجلہ ''العروۃ الوثقیٰ'' سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انگریزوں نے بہت پادریوں اور ہندوستان میں موجود دوسرے دینی فرقوں کے رہنماؤں کو اکسایا کہ ایسی تصنیفات و تالیفات لکھیں جن میں اسلام اور مسلمانوں کی توہین کریں تاکہ مسلمان اپنا دین چھوڑیں اور عیسائیت کو اپنائیں۔ مگر وہ ناکام رہے ڈاکٹر الہبی نے ''مجلہ العروۃ الوثقیٰ'' سے لمبا اقتباس پیش کیا جس سے ایک عبارت درج ذیل ہے:

اتفاق یہ ہوا کہ ایک شخص جس کا نام احمد خان بہادر انگریزوں کے اردگرد پھرتا رہتا تھا تاکہ ان سے کوئی فائدہ لے سکے اس نے اپنا آپ پیش کیا یہاں تک کہ وہ اپنے دین سے نکلنے اور انگریزوں کے دین کو اپنانے کے لیے تیار ہوگیا چناں چہ انھوں نے انگریزوں کے قریب ہونے کے لیے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ توریت اور انجیل میں کوئی تحریف نہیں کی گئی اور نہ کوئی تبدیلی پھر اس نے اپنے کیے پر غور کیا تو پتہ چلا کہ انگریز کسی طور سے اس سے راضی نہیں ہے جب تک کہ وہ یہ نہ کہے کہ میں نصرانی ہوں اور یہ کہ اُسے اس گھٹیا کتاب پر، جو اس نے لکھی ہے، کوئی بڑا اجر نہیں ملے گا، خاص طور پر کہ اس طرح کی کتاب اس سے پہلے ہزاروں پادریوں سے لکھی گئی اور اس کے نتیجے میں کسی بھی مسلمان نے اپنا دین نہیں چھوڑا تو سرسید نے اپنے انگریز حکام کی خدمت کے لیے اور راستہ اختیار کیا، یعنی مسلمانوں میں تفرقہ ڈالے، اور ان میں انتشار پھیلادے تو وہ دہری اور نیچری کے روپ میں سامنے آیا اور اعلان کیا کہ اندھی نیچر کے علاوہ کچھ نہیں اس کائنات کا کوئی حکیم معبود نہیں'' یہ تو واقعی کھلی گمراہی ہے، ''اور یہ کہ تمام انبیا نیچر کے علاوہ کسی چیز پر یقین نہیں رکھتے تھے چاہے وہ خدا ہی کیوں نہ ہو جسے ہم نے ادیان کے ذریعے پہچانا'' نعوذ باللہ ''اور اپنے آپ کو نیچری کا لقب دیا... تب جا کے انگریزی حکام کو سرسید پسند آنے لگا انھوں نے اسے مسلمانوں کے دلوں میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے بہترین وسیلہ سمجھا۔ چناں چہ اُسے بہت عزت واکرام سے نوازا علی گڑھ میں ایک سکول بنانے (کھولنے) میں مدد کی، اور اس کا نام (محمڈن سکول) رکھا تاکہ یہ مسلمانوں کے بچوں کے لیے ایک جال کی طرح ہو جس میں ان کی تربیت احمد خان بہادر کے افکار وخیالات کے مطابق کی جا سکے۔(۲۰)

سرسید احمد خان کے بارے میں ایک عام تصور ہے کہ وہ انگریزوں کے دوست، مشرقی تہذیب کے مخالف اور مغربی تہذیب کے حامی، کچھ اسلامی عقائد کے منکر اور کچھ اور کے گمراہ مفسر تھے۔ یہی تصور مصر کے مذہبی اور علمی حلقوں میں سرسید کے بارے میں عام ہے۔ جب کبھی سرسید کا نام لیا جائے گا، یہی کہا جائے گا کہ وہ اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت کے مخالف تھے۔ وہ برطانیہ کے ایجنٹ تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ برصغیر پر انگریزوں کا قبضہ ختم ہو۔ ۱۸۵۷ء

کی جنگ آزادی کی مخالفت کی۔ مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی میں رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ مغربی تہذیب سے انتہائی حد تک مرعوب تھے۔ اس تصور کا انعکاس ہمیں سرسید احمد خان کے متعلق مصر میں لکھی ہوئی اکثر کتابوں میں ملتا ہے۔ میری نظر میں اس کٹر تصور کی دو بنیادی وجوہات ہیں:

۱۔ سرسید کی وہ روش تھی جو انھوں نے اختیار کی تھی، جس میں دو مسئلے نمایاں طور پر ابھرے۔

پہلا مسئلہ: سرسید نے چند بنیادی اسلامی اصول وعقائد سے تجاوز کیا۔ جس کی وجہ سے مذہبی حلقوں میں ان کی مخالفت شروع ہوئی۔ کئی علمائے دین ان سے بدظن ہوئے۔ اور ان پر بہت اعتراضات کیے گئے اور ان کے خلاف کفر کے فتوے بھی دیے گئے۔ اسی طرح سرسید نے چند متفرق مذہبی معاملات کو عقلی طور پر آزادانہ طریقے سے بیان کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے ان سے تاویل وتفسیر میں بھول ہوئی۔ مثال کے طور پر ان کا معجزے سے انکار کرنا۔ ان کا کہنا کہ نماز صرف کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے پڑھنا لازمی نہیں۔ ان کا کہنا کہ عیسائیوں کا کھانا کھانا، چاہے گوشت حلال طور پر ذبح نہ کیا گیا ہو، تو بھی ہم پر حلال ہے۔ حقیقت میں یہ روش اس زمانے کی مسلم دنیا میں مغربی تہذیب سے مرعوبیت کے نتیجے میں کہیں کہیں نظر آنے لگی۔

بعض اردو مصادر ومراجع میں بھی ہمیں اس قسم کی باتیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر سید ابوالحسن ندوی اس سلسلے میں کہتے ہیں: سرسید کا نقطۂ نظر خالص مادی ہوگیا۔ وہ مادی طاقتوں اور کائناتی قوتوں کے سامنے بالکل سرنگوں نظر آنے لگے ہیں۔ وہ اپنے عقیدے اور قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی بنیاد پر کرنے لگے۔ انھوں نے اس میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ عربی زبان ولغت کے مسلمہ اصول وقواعد اور اجماع وتواتر کے خلاف کہنے میں بھی ان کو باک نہ رہا۔ چناں چہ ان کی تفسیر نے دینی وعلمی حلقوں میں سخت برہمی پیدا کردی۔(۲۱)

دوسرا مسئلہ: سرسید نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے متعلق دوستانہ موقف اختیار نہیں کیا۔ اس میں انگریزوں کے ساتھ ایک مصالحتی رخ اپنایا۔ جنگ آزادی کو ''غدر'' کا نام دیا۔ اس جنگ آزادی میں سرسید کی ہمدردیاں انگریزوں سے نمایاں تھیں۔ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت کو ''دنیا کے بہترین واقع'' سے تعبیر کیا۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی انگریزوں سے مسلسل مفاہمت اور وفاداری کے عوض انھیں ۱۸۸۸ء میں سر کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء میں اڈنبرا یونی ورسٹی سے انھیں (ڈاکٹر آف لاز) کی ڈگری ملی۔ سرسید کی لکھی ہوئی کتاب ''سیرت فریدیہ'' کے پیش نظر یہ کہا گیا کہ سرسید کے خاندانی ماحول میں انگریز دوستی اس حد تک رچی بسی تھی کہ انگریزی حکام وقت بے وقت ان کے گھر آ جاتے تھے۔ اپنے مسائل کے حل میں ان کی سوجھ بوجھ پر انگریزی حکام کو مکمل بھروسہ تھا۔(۲۲) چناں چہ ان ساری باتوں کی روشنی میں مسلمانوں کے قومی جذبات کا مجروح ہونا، اور سرسید سے بدگماں ہونا قدرتی بات تھی۔

۲۔ جن مصادر کے ذریعے مصریوں کو سرسید احمد خان کے بارے میں علم ہوا، ان مصادر میں یا تو سرسید کی

دوسری تعلیمی اور اجتماعی خدمات کا سرے سے ذکر نہیں کیا گیا، یا پھر سرسری طور پر ذکر کیا گیا، جس سے ان خدمات کی اہمیت اجاگر نہ ہوسکی۔ اور یہی کمی ہے جسے مصری یونی ورسٹیوں اور خصوصاً الازہر یونی ورسٹی کے شعبہ ہائے اردو کے نصاب کے ذریعے پورا کر رہے ہیں۔

مصری جامعات میں سرسید اور اردو

اولاً: مصر میں اردو

مصری یونی ورسٹیوں میں اُردو زبان وادب کی تدریس کا آغاز بیسویں صدی کے نصفِ اول میں ہوا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں قاہرہ یونی ورسٹی میں مشرقی زبانوں کی تعلیم وتدریس کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ ''معہد الالسنۃ الشرقیۃ'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے نصاب میں شاہی فرمان کے ذریعہ اردو زبان کو بھی شامل کیا گیا۔ اِس وقت قاہرہ یونی ورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈیپارٹمنٹ آف اورینٹل لینگویجز میں اردو زبان ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔

۱۹۶۲ء میں جامعہ ازہر کے فیکلٹی آف اصول الدین کے شعبہ دعوت و ارشاد میں اردو کی تدریس شروع ہوئی۔[۲۳] ۱۹۷۹ء میں عین شمس یونی ورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈیپارٹمنٹ آف اورینٹل لینگویجز میں اردو سیکشن شروع ہوا۔ سالِ اول میں ڈیپارٹمنٹ کے طلبا وطالبات عربی اور انگریزی کے علاوہ اردو، فارسی اور ترکی پڑھتے ہیں۔ پھر سالِ دوم میں انھیں اردو، فارسی اور ترکی کے امتحان میں حاصل شدہ نمبروں کے مطابق الگ الگ سیکشن میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جن کے نمبر اردو میں زیادہ ہیں وہ اردو سیکشن میں جاتے ہیں، اسی طرح فارسی اور ترکی۔

اسکندریہ یونی ورسٹی ۱۹۳۸ء میں قائم ہوئی۔ شروع میں ''معہد اللغات الشرقیۃ: انسٹی ٹیوٹ آف اُورینٹل لینگویجز'' میں طلبا مشرقی زبانیں (فارسی، ترکی، عبرانی) پڑھتے تھے۔ بیسویں صدی کے ربعِ آخر (۱۹۸۰ء) میں اس انسٹی ٹیوٹ کے نصاب میں اردو زبان بھی شامل کی گئی۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۴ء میں اسکندریہ یونی ورسٹی ہی کی فیکلٹی آف آرٹس میں ڈیپارٹمنٹ آف اُورینٹل لینگویجز کا افتتاح ہوا۔ اس شعبے میں طالبعلم بنیادی طور پر فارسی پڑھتا ہے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ اس کو ترکی اور اردو دونوں میں سے ایک لازمی پڑھنا ہوتا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کی نویں دہائی میں منصورہ یونی ورسٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ فیکلٹی آف آرٹس کے ڈیپارٹمنٹ آف اورینٹل لینگویجز کے نصاب میں اردو زبان کو ایک اختیاری زبان کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔ طالبعلم بنیادی طور پر فارسی پڑھتے ہیں۔ فارسی کے ساتھ ساتھ ترکی یا اردو پڑھتا ہے۔ پوسٹ گریجویٹ کے مرحلے میں جس طالبعلم نے فارسی کے ساتھ اردو پڑھی، وہ اردو ہی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کا حقدار ہوتا ہے۔

۲۰۱۵ء میں طنطا یونی ورسٹی، اور ۲۰۱۶ء میں منوفیہ یونی ورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈپارٹمنٹ آف اُرینٹل

لینگویجز کے نصابات میں اردو زبان کو بحیثیت معاون زبان کے شامل کیا گیا یوں تو مصر کی چھ بڑی سرکاری یونی ورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔(۲۴)

موجودہ دور میں مصر میں اردو کی ترویج اور خدمت کی فعال سرگرمیوں کے سلسلے میں الازہر یونی ورسٹی ہی کا نام سب سے پہلے آئے گا وجہ یہ ہے کہ الازہر یونی ورسٹی میں اردو زبان وادب کے دو مستقل شعبے ہیں، جہاں اردو بحیثیت بنیادی زبان کے پڑھائی جاتی ہے، جب کہ باقی یونی ورسٹیوں میں اردو کو ایک ثانوی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

ثانیاً: سرسید تحقیقی مقالوں میں:

مصری یونی ورسٹیوں میں جہاں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے، قواعد وضوابط کے مطابق ایم اے اور ایم فل کے طلبہ جس کتاب پر تحقیق کا کام کریں (چاہے یہ شعری مجموعہ ہو، یا افسانوں کا مجموعہ، داستان ہو یا ناول ہو، ڈراما ہو یا ناولٹ، برصغیر پاک وہند کی تاریخ سے متعلق ہو یا اس کی تہذیب وثقافت)، اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرنا لازمی ہے اس بہانے سے مصری جامعات میں اردو سے عربی میں بہت کتابیں ترجمہ ہوئیں درج ذیل کتابوں کی فہرست ملاحظہ کریں:

۱۔ آنندی (غلام عباس)۔ اخلاص عبد الفتاح، (الازہر یونی ورسٹی)۔

۲۔ انارکلی (امتیاز علی تاج)۔ عبیر عبد الکریم۔ (الازہر یونی ورسٹی)۔

۳۔ چاندنی بیگم (قرۃ العین حیدر)۔ دعا محمد حسن۔ (الازہر یونی ورسٹی)۔

۴۔ ضبط کی دیوار (ڈاکٹر سلیم اختر)۔ نیفین عمر وحسانین منازع۔ (الازہر یونی ورسٹی)۔

۵۔ مکاتیب ضیاء الامت (پیر محمد کرم شاہ)۔ رھام عبد اللہ سلامۃ۔ (الازہر یونی ورسٹی)۔

۶۔ رباعیاتِ محروم (تلوک چند محروم)۔ بدریۃ محمد احمد عبد القادر۔ (الازہر یونی ورسٹی)۔

۷۔ سیرت الرسول ﷺ کی نویں جلد (طاہر القادری)۔ نادیۃ محمود جمعۃ امین۔ (الازہر یونی ورسٹی)۔

۸۔ دیوان حمد ونعت (ع س مسلم)۔ حبیبۃ محمد حسن بدوی۔ (الازہر یونی ورسٹی)۔

۹۔ ابن الوقت (نذیر احمد دہلوی)۔ زینب السید عبد الحکیم۔ (الازہر یونی ورسٹی)۔

۱۰۔ چور بخار، ننگے پاؤں اور متاعِ غرور (اشفاق احمد)۔ فاطمۃ راغب۔ (الازہر یونی ورسٹی)۔

۱۱۔ مدینۃ الیہود (محمد سعید) اسماء الامیر عبد الحمید، (الازہر یونی ورسٹی)۔

۱۲۔ برگ نے (ناصر کاظمی) سلوی محمود امین، (الازہر یونی ورسٹی)۔

۱۳۔ عام آدمی کے خواب (رشید امجد) بسمہ محمد احمد عبد القادر، (الازہر یونی ورسٹی)۔

۱۴۔ سن فلاور، انھونیاں، رنگ پچکاری (ابدال بیلا) امیرۃ ابراہیم الدعدع، (الازہر یونی ورسٹی)۔

۱۵۔ پاکستان ناگزیر تھا (حسن ریاض) صباح علی عبد المعز، (الازہر یونی ورسٹی)۔
۱۶ پاک بھارت تعلقات (طارق اسماعیل ساگر) فاطمۃ عبد التواب عبد الحمید، (الازہر یونی ورسٹی)۔
۱۷۔ محبت ایسا دریا ہے (امجد اسلام امجد) یاسمین جابر محمد، (الازہر یونی ورسٹی)۔
۱۸۔ گدھے ہمارے بھائی ہیں (مستنصر تارڑ) صفیۃ عبد الناصر محمد، (الازہر یونی ورسٹی)۔
۱۹۔ تاریخ ارض القرآن (سید سلیمان ندوی) فاطمۃ بدر الدین، (الازہر یونی ورسٹی)۔
۲۰۔ امراؤ جان ادا (مرزا محمد ہادی رسوا) ۔ ھناء عبد الفتاح عبد الجواد، (الازہر یونی ورسٹی)۔
۲۱۔ باقیاتِ فانی (فانی بدایونی) سعد عبد الرحیم سید، (الازہر یونی ورسٹی)۔
۲۲۔ گردش رنگ چمن (قرۃ العین حیدر) شحات الازرق منصور فرج، (الازہر یونی ورسٹی)
۲۳۔ خاک اور خون (نسیم حجازی) عبد الرحیم عبد الغنی، (الازہر یونی ورسٹی)
۲۴۔ پاکستان، تاریخ وسیاست (صفدر محمود) اسامہ شلبی، (الازہر یونی ورسٹی)
۲۵۔ دو ہاتھ (عصمت چغتائی) غادۃ مصطفی کامل، (الازہر یونی ورسٹی)
۲۶۔ تحریک جماعت اسلامی (ڈاکٹر) ولاء احمد، (الازہر یونی ورسٹی)
۲۷۔ آوارہ گرد کی ڈائری (ابن انشا) ہیام خلیفہ حامد، (الازہر یونی ورسٹی)
۲۸۔ صدر محترم (اشرف شاد)۔ اسامہ امین ابو طالب، (الازہر یونی ورسٹی)
۲۹۔ التوحید کی پہلی جلد (طاہر القادری) امل ممدوح، (الازہر یونی ورسٹی)
۳۰۔ سب ٹھیک ہے (اقبال نیازی) اسماء شعبان، (الازہر یونی ورسٹی)
۳۱۔ وجہی سے عبد الحق تک (سید عبد اللہ) ایہاب مختار، (الازہر یونی ورسٹی)
۳۲۔ جامع الامثال (وارث ہندی) می جلال، (الازہر یونی ورسٹی)
۳۳۔ پرندے (جوگندر پال) دعاء حمودہ، (الازہر یونی ورسٹی)
۳۴۔ شگوفے (شفیق الرحمٰن) یاسمین محمد عبد الرحمٰن، (الازہر یونی ورسٹی)
۳۵۔ تنہا (سلمی اعوان) احمد السید رضوان، (الازہر یونی ورسٹی)
۳۶۔ پھول گرتے ہیں (اے حمید) حجازی ربیع توفیق، (الازہر یونی ورسٹی)
۳۷۔ صیدِ ہوس، یہودی کی لڑکی (آغا حشر کاشمیری) یاسر عبد ربہ، (الازہر یونی ورسٹی)
۳۸۔ مہر افروز (عیسوی خان بہادر) ہدیر مصطفی سید مصطفی، (عین شمس یونی ورسٹی)
۳۹۔ اخلاق ہندی (میر بہادر علی حسینی) منال عبد العظیم سعید، (عین شمس یونی ورسٹی)

۴۰۔ نگاہِ غفلت (طالب بنارسی) زینب ہانی حلمی، (عین شمس یونی ورسٹی)
۴۱۔ اپنے دکھ مجھے دے دو (راجندر سنگھ بیدی) رحاب مصطفی محمد، (عین شمس یونی ورسٹی)
۴۲۔ ملک العزیز وورجینیا (عبد الحلیم شرر) رانیا محمد فوزی، (عین شمس یونی ورسٹی)
۴۳۔ آنگن (خدیجہ مستور) منی حندقہا، (عین شمس یونی ورسٹی)
۴۴۔ مجالس النسا (الطاف حسین حالی) ہبۃ محمد السعید، (عین شمس یونی ورسٹی)
۴۵۔ ٹیڑھی لکیر (عصمت چغتائی) سلوی احمد حافظ، (عین شمس یونی ورسٹی)
۴۶۔ خوشبو (پروین شاکر) ولاء سید عبد الستار، (عین شمس یونی ورسٹی)
۴۷۔ سیرتِ عائشہ (سید سلیمان ندوی) وسام حسین السید، (عین شمس یونی ورسٹی)
۴۸۔ کاروانِ حرم (ع س مسلم) ایمان شکری طہ، (عین شمس یونی ورسٹی)
۴۹۔ سوانح قیس مفتون (حافظ عبد اللہ) محمود عبد المنصف، (عین شمس یونی ورسٹی)
۵۰۔ لرز مایش ''اور'' حبہ خاتون (محمد مجیب) ایمان فاروق احمد، (عین شمس یونی ورسٹی)
۵۱۔ باپ کا گناہ (حکیم احمد شجاع) محمد علی عبد الحلیم، (عین شمس یونی ورسٹی)
۵۲۔ کہی نہ جائے (ممتاز مفتی) رباب محمد احمد، (عین شمس یونی ورسٹی)
۵۳۔ خوابِ گل پریشان ہے (احمد فراز) بسنت محمد شکری، (عین شمس یونی ورسٹی)
۵۴۔ صلاح الدین (قاضی عبد الستار) امیرۃ احمد ماہر، (عین شمس یونی ورسٹی)
۵۵۔ باغ و بہار (میر امن) دینا احمد جاویش، (عین شمس یونی ورسٹی)
۵۶۔ عجائب القصص (شاہ عالم ثانی) دینا احمد جاویش، (عین شمس یونی ورسٹی)

یہ تھے چند کتابوں کے نام جن کا ترجمہ تحقیقی مقالوں میں ہوا دوسرے مقالات جن میں کسی کتاب کا صرف ایک حصہ یا اس سے انتخاب کا ترجمہ ہوا، ان کے علاوہ ہیں۔ ان مقالات میں الازہر یونی ورسٹی کا نام نمایاں ہے ان علمی وتحقیقی مقالوں میں سے صرف دو مقالے ایسے ہیں جو سرسید پر براہ راست لکھے گئے۔ ان دونوں مقالوں کا موضوع سرسید کے مقالات کا مطالعہ ہے

۱۔ المقالۃ الاخلاقیۃ والاصلاحیۃ عند السیر سید احمد خان، دراسۃ تحلیلیۃ نقدیۃ: سرسید احمد خان کے اخلاقی اور اصلاحی مقالات کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ اور عربی میں ترجمہ ولاء جمال (عین شمس یونی ورسٹی)۔
۲۔ المقالۃ الاجتماعیۃ عند السیر سید احمد خان، دراسۃ تحلیلیۃ نقدیۃ: سرسید احمد خان کے معاشرتی وسماجی مقالات کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ اور عربی میں ترجمہ نور الہدی (عین شمس یونی ورسٹی)

ثالثاً: سرسید پوسٹ ڈاکٹریٹ کے مقالوں میں:

اس کے علاوہ پوسٹ ڈاکٹریٹ کا ایک مقالہ ہے وہ بھی سرسید کے مقالات سے متعلق ہے، یعنی: صورۃ مصر فی مقالات السیر سید احمد خان: مصر مقالاتِ سرسید احمد خان میں ڈاکٹر: یوسف السید یوسف (الازہر یونی ورسٹی)

رابعاً: سرسید شعبہ ہائے اردو کے نصاب میں:

جامعہ الازہر کے بعد جتنی جامعات نے اردو کو اپنے نصاب میں شامل کیا سب نے الازہر یونی ورسٹی ہی کے شعبہ ہائے اردو کے نصاب کو سامنے رکھ کر کیا۔ شعبہ اردو، الازہر یونی ورسٹی، گرلز برانچ (جو مصر اور عالمِ عرب میں اب تک سب سے جدید مستقل شعبہ اردو ہے۔ اور سٹوڈنٹس کی تعداد کے حوالے سے سب سے بڑا ہے) کے نصاب کے مطابق سالِ اول کی طالبات پہلے سمسٹر میں ہفتے میں (۱۸ گھنٹے: تین مضمون) اور دوسرے سمسٹر میں (۱۸ گھنٹے: چار مضمون) اردو پڑھتی ہیں۔ سالِ دوم کی طالبات پہلے سمسٹر میں (۲۴ گھنٹے: پانچ مضمون) اور دوسرے سمسٹر میں (۱۶ گھنٹے: دو مضمون) اردو پڑھتی ہیں۔ سالِ سوم کی طالبات پہلے سمسٹر میں (۲۲ گھنٹے: چار مضمون) اور دوسرے سمسٹر میں (۱۸ گھنٹے: چار مضمون) اردو پڑھتی ہیں سالِ چہارم کی طالبات پہلے سمسٹر میں (۲۰ گھنٹے: چار مضمون) اور دوسرے سمسٹر میں (۱۸ گھنٹے: چار مضمون) اردو پڑھتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر میں اردو کی تعلیم وتدریس کس بنیاد پر ہو رہی ہے۔ الازہر کے مقاصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے طالبات ہر سمسٹر میں دینی اور عربی مضمون پڑھتی ہیں۔ جن مضامین میں سرسید احمد خان کا براہِ راست مطالعہ کرنے کی گنجائش ہے وہ ہیں:

۱۔ سالِ سوم: اردو نثر اُنیسویں صدی عیسوی میں۔ (ہفتے میں ۲ گھنٹے)۔

۲۔ سالِ سوم: برِعظیم پاک وہند کے مسلمانوں کی تاریخ [قیامِ پاکستان تک]۔ (ہفتے میں ۲ گھنٹے)۔

۳۔ سالِ سوم: اردو اسالیب۔ (ہفتے میں ۴ گھنٹے)۔

۴۔ سالِ سوم: اصولِ تحقیق [اردو سے متعلق موضوعات]۔ (ہفتے میں ۴ گھنٹے)۔

۵۔ سالِ چہارم: جدید اور معاصر اردو نثر کا مطالعہ۔ (ہفتے میں ۲ گھنٹے)۔

۶۔ سالِ چہارم: پاکستان کی جدید اور معاصر تاریخ [اردو ٹیکسٹ سمیت]۔ (ہفتے میں ۲ گھنٹے)۔

۷۔ سالِ چہارم: اردو تنقید۔ (ہفتے میں ۴ گھنٹے)۔

۸۔ سالِ چہارم: اردو اسالیب۔ (ہفتے میں ۴ گھنٹے)۔

۹۔ سالِ چہارم: اصولِ تحقیق [اردو سے متعلق موضوعات]۔ (ہفتے میں ۴ گھنٹے)۔

ایک تجزیہ:

مصری یونی ورسٹیوں میں شعبہ ہائے اردو میں تحقیقی مقالوں میں زبان وادب پر زور دیا جاتا ہے سرسید کی علمی وادبی خدمات کے پیشِ نظر جن مقالوں کے موضوع کا تعلق ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۴۷ء تک کے عرصے سے ہوتا ہے، ان میں سرسید احمد خان اور ان کی علمی وادبی خدمات کو نمایاں کیا جاتا ہے اردو زبان وادب پر ان کے احسانات کا ذکر کیا جاتا ہے تعلیم کے میدان میں ان کی کوششوں کو سراہا جاتا ہے علی گڑھ تحریک پر روشنی ڈالی جاتی ہے دوقومی نظریہ اور تحریکِ پاکستان کی بنیاد سرسید اور ان کی تحریک سے جوڑی جاتی ہے اور یہی معاملہ درج بالا مقالات کا بھی ہے۔ تحقیقی مقالے مکمل ہونے کے بعد کتابی شکل میں چھپ جاتے ہیں اور یوں پڑھے لکھے طبقے کے لوگوں کی نظر سے گذرتے ہیں اور انھیں پڑھنے کی نوبت بھی آتی ہے، دوسرے لفظوں میں ان لوگوں کو سرسید احمد خان کی علمی وادبی خدمات کا پتہ چلتا ہے، جس کے نتیجے میں لوگوں کے ذہن میں موجود سرسید کے بارے میں جو روایتی تصور ہے، وہ آہستہ آہستہ تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔

یہاں ہمیں اعتراف یہ کرنا پڑے گا کہ یہ معاملہ وقت طلب ہے ہمیں توقع نہیں ہونی چاہیے کہ جس پیمانے پر اور مختصر وقت میں مصر سمیت عالمِ عرب میں علامہ محمد اقبال کا تعارف ہوا، اسی پیمانے پر اور اتنے وقت میں سرسید احمد خان کا ہوگا اور حقیقت میں علامہ محمد اقبال اس مقام کے حقدار ہیں۔

نتائج

مصری یونی ورسٹیوں میں سرسید احمد خان کے مطالعے کے اس تجزیے کی روشنی میں ہم درج ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں:

۱۔ سرسید احمد خان ایک مختلف الحیثیات اور کثیر الجہات شخص تھے انھوں نے اپنی ہنگامہ خیز زندگی میں سیاسی، تعلیمی، مذہبی، ادبی، تحقیقی، غرض ہر قسم کے علمی اور قومی مشاغل میں نمایاں حصہ لیا انھوں نے عمل کے ہر میدان میں اپنا نقش بٹھایا، اور ہر جگہ دیرپا اثرات چھوڑے۔ (۲۵)

۲۔ مذہبی مسائل پر مقالے اور کتابیں لکھنا سرسید احمد خان کے اصل مقاصد میں شامل نہیں تھا نہ ہی یہ ان کا اصل میدان تھا۔ بات یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کے مخصوص مذہبی، ثقافتی معاشی اور معاشرتی حالات کے پیشِ نظر سرسید کے نزدیک مذہبی بحثوں میں الجھے بغیر مضمون نگاری کرنا ناممکن ہے اس وجہ سے ''تہذیب الاخلاق'' میں سرسید کے مضامین میں مذہبی رنگ پایا جاتا ہے حالاں کہ خود سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' ہی میں کئی مرتبہ یہ اعلان کیا کہ مذہبی بحث اس پرچے کا مدعا نہیں مگر چوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے مثل ہندوؤں کے مذہب، تمدن اور معاشرت متحد سمجھ رکھا ہے .... اس لیے مجبوراً مذہبی بحث کرنی پڑ جاتی ہے۔ ورنہ اس پرچے میں ہم کو عقائد ومسائل مذہبی سے بحث کرنا مقصود اصلی نہیں۔ (۲۶) ہماری نظر میں شاید یہی وجہ ہے کہ سرسید نے مذہبی مسائل پر مقالے اور کتابیں لکھیں۔

۳۔ سرسید کے مذہبی خیالات ورجحانات نے ہندوستان بھر میں آگ لگادی چناں چہ اس تحریک کے خلاف رد عمل بھی کوئی کم شدید نہ ہوا انفرادی احتجاج اور کٹر ملّاؤں کی تکفیر سے قطعِ نظر ''اودھ پنچ''(۲۷) کی صورت میں اچھا خاصہ متحدہ محاذ قائم ہوا جس میں سرسید پر شدید تنقید ہوتی رہی انھیں ''پیر نیچر'' کے خطاب سے نوازا گیا اور علی گڑھ کالج کو لامذہبیت کا مرکز قرار دیا گیا اور یوں سرسید کی تحریک ''نیچریہ مذہب'' قرار پائی۔(۲۸)

۴۔ مذہبی افکار وخیالات کے حوالے سے ہندوستان میں سرسید کے بارے میں یہی تصور مصر میں مجلہ ''العروۃ الوثقیٰ'' اور مولانا سید سلیمان ندوی کی عربی تصانیف کے ذریعے پہنچا۔ پھر ان دونوں کو بنیاد بنا کر مزید کتابیں لکھی گئیں۔ جس کی وجہ سے مصری مذہبی حلقوں میں یہ تصور راسخ ہوگیا۔

۵۔ اس کے باوجود مصر میں ایسی تصانیف بھی ملیں گی جن میں سرسید کے انھی مذہبی رجحانات کو سراہا گیا۔

۶۔ مصری یونی ورسٹیوں میں شعبہ ہائے اردو زبان وادب سرسید احمد خان کی علمی وادبی تحریک کے مطالعے کو اپنے نصاب میں داخل کر کے انھیں وہ علمی وادبی مقام دلانے میں سعیٔ مشکور کر رہے ہیں جس کے سرسید مستحق ہیں۔

۷۔ مصر کے پڑھے لکھے اور مذہبی حلقے کے لوگوں کے ذہن میں موجود سرسید کے بارے میں جو روایتی تصور ہے، اسے بہتر بنانے کے لیے وقت درکار ہے۔ یہ تبدیلی آہستہ آہستہ ہوسکتی ہے لہٰذا ہمیں توقع نہیں ہونی چاہیے کہ جس پیمانے پر اور مختصر وقت میں مصر سمیت عالمِ عرب میں علامہ محمد اقبال کا تعارف ہوا، اسی پیمانے پر اور اتنے وقت میں سرسید احمد خان کا ہوگا۔

حواشی:

(۱) مجیب الرحمٰن، سید جمال الدین افغانی اور مولانا عبید اللہ سندھی کے تصور انقلاب کا تقابلی جائزہ، پی ایچ ڈی کا مقالہ، شعبۂ علومِ اسلامیہ، (ملتان: بہاؤ الدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۲

(۲) سید آل اظہر آنس، سرسید کے معترضین: تنقیدی وتحقیقی جائزہ، پی ایچ ڈی کا مقالہ، (پشاور: شعبۂ اردو، پشاور یونی ورسٹی، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۶

(۳) مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۷۴ء)، ص ۹۴، ۹۵

(۴) رسالہ تہذیب الاخلاق ۱۸۷۰ء میں جاری ہوا، اور ۱۸۷۷ء تک نکلتا رہا۔ اس سات سالہ دور میں سرسید نے ۱۱۲ مضامین لکھے۔ سن ۱۸۷۹ء میں تہذیب الاخلاق کے دور جدید کا آغاز کیا۔ اب کے یہ رسالہ ۲۹ مہینے (جولائی ۱۸۸۷ء تک) جاری رہا۔ اس عرصے میں سرسید نے اس میں ۲۳ مضامین لکھے۔ تہذیب الاخلاق کے دور سوم کا آغاز

۱۸۹۴ء میں ہوا، اور اب کے یہ ۱۸۹۷ء تک نکلتا رہا۔ اس تین سالہ دور میں سر سید نے ۷۳ مضامین لکھے۔ سر سید کی تصنیفات وتالیفات کی تدوین میں ڈاکٹر سید عبد اللہ کی کتاب سرسید احمد خان اوران کے نامور رفقا سے مدد لی گئی۔

(۵) میرٹھ میں سر سید احمد خان کی تقریر، مؤرخہ ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء

(۶) نسیم قریشی، اردو ادب کی تاریخ، (علی گڑھ: ۱۹۷۸ء)، ۱۶۴، ۱۶۵

(۷) مقالات سرسید، حصۂ ہشتم، مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، (لاہور: مجلس ترقی ادب)، ص ۱۶۴

(۸) ایضاً، ص ۱۶۵، ۱۶۴

(۹) ایضاً، ص ۱۶۶، ۱۶۵

(۱۰) ایضاً، ص ۱۶۶

(۱۱) ایضاً، ص ۱۶۷، ۱۶۶

(۱۲) ایضاً، ص ۱۶۷

(۱۳) ایضاً، ص ۱۷۰

(۱۴) ایضاً، ص ۱۷۰

(۱۵) ایم اے کرندیکر، اسلام اور ہندوستان کا جدیدیت کی جانب سفر، (کراچی: ایسٹرن پبلشر)، ص ۱۴۸ء، بحوالہ سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت۔

(۱۶) احمد امین، زعماء الاصلاح في العصر الحديث، (بیروت: دار الکتاب العربی)، ت د، ص ۱۲۵۔

(۱۷) ایضاً، ص ۱۲۱

(۱۸) ایضاً، ص ۱۳۷

(۱۹) ظفر حسن، سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت، پی ایچ ڈی کا مقالہ، شعبہ اردو، (جام شورو: جامعہ سندھ، ۱۹۷۵ء)، ص ۴۷۔

(۲۰) ڈاکٹر محمد البہی، الفکر الاسلامي الحديث وصلته بالاستعمار الغربي، ص ۲۹

(۲۱) مولانا سید سلیمان ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۷۴ء)، ص ۹۷

(۲۲) ظفر حسن، سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت، ص ۱۴

(۲۳) فوقیہ افضل، مصر میں اردو کی ترویج: ڈاکٹر ابراھیم محمد ابراھیم کی خدمات کا جائزہ، مقالہ برائے ایم اے، (لاہور: اردو یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، ۲۰۰۷۔ ۲۰۰۹م) ص ۵۳

(۲۴) فی الحال اردو کسی بھی پرائیویٹ یونی ورسٹی میں نہیں پڑھائی جاتی۔

(۲۵) سید عبد اللہ، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری تجزیہ، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء)، ص ۳

(۲۶) ڈاکٹر سید عبد اللہ، سرسید اور ان کے نامور رفقا، ص ۱۶

(۲۷) اودھ پنچ ۱۶ جنوری ۱۸۷۷ء منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے نکالا ہر جمعرات کو نکلتا۔ ۱۲ صفحات ہوتے تھے یہ اپنے وقت کا مقبول ترین مزاحیہ اخبار تھا ۱۹۱۳ء میں یہ اخبار بند ہوا۔

(۲۸) سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۳۳۴

مصادر و مراجع

اولاً: اردو کتب اور علمی مقالے:

۱۔ آنس، سید آل اظہر، سرسید کے معترضین، تنقیدی و تحقیقی جائزہ، پی ایچ ڈی کا مقالہ، شعبہ اردو، پشاور: پشاور یونی ورسٹی، ۲۰۰۲ء

۲۔ اختر، سلیم، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، انتیسواں ایڈیشن

۳۔ افضل، فوقیہ، مصر میں اردو کی ترویج: ڈاکٹر ابراھیم محمد ابراھیم کی خدمات کا جائزہ، مقالہ برائے ایم اے، لاہور: اردو یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، ۲۰۰۷۔ ۲۰۰۹م

۴۔ پانی پتی، جمال (مرتب)، مضامین سلیم احمد، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۹ء

۵۔ پانی پتی، محمد اسماعیل، مولانا (مرتب)، مقالاتِ سرسید، حصۂ ہشتم، لاہور: مجلس ترقی ادب

۶۔ تونسوی، طاہر، ڈاکٹر (مرتب)، ارمغانِ ڈاکٹر سلیم اختر، فیصل آباد: ادارہ تالیف وتصنیف وترجمہ، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، ۲۰۱۴ء

۷۔ جبین، رخسانہ، سرسید کی نظر میں تعلیم کے مقاصد، مشمولہ مجلّہ پیغام آشنا، جلد ۱۶، شمارہ ۶۰، (جنوری تا مارچ ۲۰۱۵ء)

۸۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اردو، جلد چہارم، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۲۰۱۵ء

۹۔ حسن، ظفر، سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت، پی ایچ ڈی کا مقالہ، شعبہ اردو، جام شورو: جامعہ سندھ، ۱۹۷۵ء

۱۰۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری تجزیہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء

۱۱۔ _____، وجہی سے عبدالحق تک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء

۱۲۔ قریشی، نسیم، اردو ادب کی تاریخ، علی گڑھ: ۱۹۷۸ء

۱۳۔ مجیب الرحمٰن، سید جمال الدین افغانی اور مولانا عبید اللہ سندھی کے تصور انقلاب کا تقابلی جائزہ، پی ایچ ڈی کا مقالہ، ملتان: شعبۂ علومِ اسلامیہ، بہاؤ الدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۷ء۔

۱۴۔ ندوی، سید ابوالحسن علی، مولانا، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۷۴ء

ثانیاً: عربی کتب اور علمی مقالات:

۱۔ ابراهيم، ابراهيم محمد، دكتور، مصر في الغزل الاردي، قاهرة: كلية الدراسات الانسانية، جامعة الازهر، ۲۰۰۱ء

۲۔ البهي، محمد، دكتور، الفكر الاسلامي الحديث وصلته بالاستعمار الغربي، قاهرة: ۱۹۶۴ء، الطبعة الرابعة

۳۔ الحفناوي، جلال، دكتور، الجماعة المسلمة في الهند، شبكة المعلومات الدولية۔

۴۔ امین، احمد، زعماء الاصلاح في العصر الحديث، بیروت: دار الکتاب العربی، ت د
۵۔ الندوی، معراج، دکتور، السير سيد احمد خان وجهوده الاصلاحية في القارة الهندية، شبکة ضياء للمؤتمرات والدراسات، ۲۰۱۵ء
۶۔ یوسف، یوسف السید، دکتور، صورة مصر في مقالات السير سيد احمد خان الاردية، جامعة الازہر: ۲۰۰۵ء

ثالثاً: عربی اور اردو مجلّات:

۱۔ مجلّة العروة الوثقى، السيد جمال الدين الافغانی، العدد ۹
۲۔ پیغام آشنا، جلد ۱۶، شمارہ ۶۰، سال ۲۰۱۵ء۔